© rasailojaraid.com

مچا رہے تھے ۲۲؎ البتہ متقی لوگ ۲۳؎ اُس روز باغوں اور چشموں میں ہونگے، جو کچھ اُن کا رب انہیں دیگا اسے خوشی خوشی لے رہے ہونگے ۲۴؎ - وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے، راتوں کو کم ہی

کوئی اثر بھی اصل بحث پر نہیں پڑتا - کوئی شخص نہ اس بنا پر آخرت کا انکار کرتا ہے کہ اس کی آمد کا سال، مہینہ اور دن نہیں بتایا گیا ہے، اور نہ یہ سُن کر اُس کی آمد کو مان سکتا ہے کہ وہ فلاں سال فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو آئے گی - تاریخ کا تعین سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے کہ وہ کسی منکر کو اقرار پر آمادہ کر دے، کیونکہ اس کے بعد پھر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ دن آنے سے پہلے آخر کیسے یہ یقین کر لیا جائے کہ اس روز واقعی آخرت برپا ہو جائے گی۔

۲۱؎ فتنے کا لفظ یہاں دو معنی دے رہا ہے - ایک معنی یہ ہیں کہ اپنے اس عذاب کا مزہ چکھو - دوسرے معنی یہ کہ اپنے اُس فتنے کا مزہ چکھو جو تم نے دنیا میں برپا کر رکھا تھا - عربی زبان میں اس لفظ کے ان دونوں مفہوموں کی یکساں گنجائش ہے -

۲۲؎ کفار کا یہ پوچھنا کہ "آخر وہ روزِ جزا کب آئے گا" اپنے اندر خود یہ مفہوم رکھتا تھا کہ اس کے آنے میں دیر کیوں لگ رہی ہے ؟ جب ہم اُس کا انکار کر رہے ہیں اور اس کے جھٹلانے کی سزا ہمارے لیے لازم ہو چکی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتا ؟ اسی لیے جہنم کی آگ میں جب وہ تپ رہے ہونگے اُس وقت اُن سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ چیز جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے - اِس فقرے سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی تھی کہ اس نے تم سے نافرمانی کا ظہور ہوتے ہی تمہیں فوراً نہ پکڑ لیا اور سوچنے، سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے وہ تم کو ایک لمبی مہلت دیتا رہا - مگر تم ایسے احمق تھے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹا یہ مطالبہ کرتے رہے کہ یہ وقت تم پر جلدی لے آیا جائے - اب دیکھ لو کہ وہ کیا چیز تھی جس کے جلدی آ جانے کا مطالبہ تم کر رہے تھے۔

۲۳؎ اِس سیاق و سباق میں لفظ متقی صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی خبر پر یقین لا کر آخرت کو مان لیا، اور وہ رویہ اختیار کر لیا جو حیاتِ اُخروی کی کامیابی کے لیے انہیں بتایا گیا تھا، اور اُس روش سے اجتناب کیا جس کے متعلق

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سوتے تھے،[۱۵] پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے،[۱۶] اور اُن کے مالوں میں حق تھا سائل

انہیں بتا دیا گیا تھا کہ یہ خُدا کے عذاب میں مبتلا کرنے والی ہے۔

[۱۴] اگرچہ اصل الفاظ ہیں اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ، اور ان کا لفظی ترجمہ صرف یہ ہے کہ "لے رہے ہوں گے جو کچھ اُن کے رب نے اُن کو دیا ہوگا" لیکن موقع و محل کی مناسبت سے اس جگہ "لینے" کا مطلب محض "لینا" نہیں بلکہ خوشی خوشی لینا ہے، جیسے کچھ لوگوں کو ایک سخی داتا مٹھیاں بھر بھر کر انعام دے رہا ہو اور وہ لپک لپک کر اسے لے رہے ہوں۔ جب کسی شخص کو اس کی پسند کی چیز دی جائے تو اس لینے میں آپ سے آپ بخوشی قبول کرنے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ اَلَمْ یَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ (التوبہ-۱۰۴)۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات لیتا ہے"۔ اس جگہ صدقات لینے سے مراد محض ان کو وصول کرنا نہیں بلکہ پسندیدگی کے ساتھ ان کو قبول کرنا ہے۔

[۱۵] مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصّہ، کم یا زیادہ، ابتدائے شب میں یا وسطِ شب میں یا آخرِ شب میں، جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابن عباسؓ، انس بن مالک، محمد الباقر، مطرف بن عبداللہ، ابو العالیہ، مجاہد، قتادہ، ربیع بن انس وغیرہم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصّہ اللہ جل شانہٗ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصری، اَحنف بن قیس، اور ابن شہاب زُہری کا ہے، اور بعد کے مفسرین و مترجمین نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ اور موقع و محل کے لحاظ سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں یہی معنی اختیار کیے ہیں۔

[۱۶] یعنی وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فسق و فجور اور فواحش میں گزارتے ہیں اور پھر بھی کسی استغفار کا خیال تک اُنہیں نہیں آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصا حصّہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے رب کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور محروم کے لیے ۔[۱۷]

کا جو حق بجا پر تھا، اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوئی۔ ھُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ کے الفاظ میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ یہ روش انہی کو زیبا تھی۔ وہی اس شانِ عبودیت کے اہل تھے کہ اپنے رب کی بندگی میں جان بھی لڑائیں اور پھر اُس پر پھولنے اور اپنی نیکی پر فخر کرنے کے بجائے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں۔ یہ اُن بے شرم گناہ گاروں کا رویّہ نہ ہو سکتا تھا جو گناہ بھی کرتے تھے اور اوپر سے اکڑتے بھی تھے۔

[۱۷] بالفاظِ دیگر، ایک طرف اپنے رب کا حق وہ اِس طرح پہچانتے اور ادا کرتے تھے، دوسری طرف بندوں کے ساتھ اُن کا معاملہ یہ تھا۔ جو کچھ بھی اللہ نے ان کو دیا تھا، خواہ تھوڑا یا بہت، اُس میں وہ صرف اپنا اور اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُن کو یہ احساس تھا کہ ہمارے اس مال میں ہر اُس بندۂ خدا کا حق ہے جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔ وہ بندوں کی مدد خیرات کے طور پر نہیں کرتے تھے کہ اُس پر اُن سے شکریہ کے طالب ہوتے اور اُن کو اپنا زیرِ بارِ احسان ٹھیراتے، بلکہ وہ اِسے اُن کا حق سمجھتے تھے اور اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے۔ پھر اُن کی یہ خدمتِ خلق صرف اُنہی لوگوں تک محدود نہ تھی جو خود سائل بن کر اُن کے پاس مدد مانگنے کے لیے آتے، بلکہ جس کے متعلق بھی ان کے علم میں یہ بات آجاتی تھی کہ وہ اپنی روزی پانے سے محروم ہو گیا ہے اس کی مدد کے لیے وہ خود بے چین ہو جاتے تھے۔ کوئی یتیم بچہ جو بے سہارا رہ گیا ہو، کوئی بیوہ جس کا کوئی سر دھرا نہ ہو، کوئی معذور جو اپنی روزی کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکتا ہو، کوئی شخص جس کا روزگار چھوٹ گیا ہو یا جس کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو، کوئی شخص جو کسی آفت کا شکار ہو گیا ہو اور اپنے نقصان کی تلافی خود نہ کر سکتا ہو، غرض کوئی حاجت مند ایسا نہ تھا جس کی حالت ان کے علم میں آئی ہو اور وہ اس کی دستگیری کر سکتے ہوں، اور پھر بھی انہوں نے اس کا حق مان کر اس کی مدد کرنے سے دریغ کیا ہو۔

یہ تین صفات ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو متقی اور محسن قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ انہی صفات نے ان کو جنت کا مستحق بنایا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت پر ایمان لا کر انہوں نے ہر اُس روش سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے[۱۸]، اور خود تمہارے اپنے وجود

پرہیز کیا جسے اللہ اور اس کے رسول نے اُخروی زندگی کے لیے تباہ کن بتایا تھا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اللہ کی بندگی کا حق اپنی جان لڑا کر ادا کیا اور اُس پر فخر کرنے کے بجائے استغفار ہی کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے اللہ کے بندوں کی خدمت اُن پر احسان سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا فرض اور اُن کا حق سمجھ کر کی۔

اس مقام پر یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ اہلِ ایمان کے اموال میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اُس سے مُراد زکوٰۃ نہیں ہے جسے شرعًا اُن پر فرض کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحبِ استطاعت مومن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے اور اپنے دل کی رغبت سے اس کو ادا کرتا ہے بغیر اس کے کہ شریعت نے اسے لازم کیا ہو۔ ابن عباسؓ مُجاہد اور زید بن اسلم وغیرہ بزرگوں نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ درحقیقت اِس ارشادِ الٰہی کی اصل روح یہ ہے کہ ایک متقی و مُحسن انسان کبھی اِس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خدا اور اس کے بندوں کا جو حق میرے مال میں تھا، زکوٰۃ ادا کر کے مَیں اُس سے بالکل سبکدوش ہو چکا ہوں، اب مَیں نے اس بات کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے کہ ہر ننگے، بھوکے، مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا پھروں۔ اس کے برعکس جو اللہ کا بندہ واقعی متقی و مُحسن ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر اُس بھلائی کے لیے جو اُس کے بس میں ہو، دل و جان سے تیار رہتا ہے اور جو موقع بھی اسے دنیا میں کوئی نیک کام کرنے کے لیے ملے اُسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اُس کے سوچنے کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا کہ جو نیکی مجھ پر فرض کی گئی تھی وہ میں کر چکا ہوں، اب مزید نیکی کیوں کروں۔ نیکی کی قدر جو شخص پہچان چکا ہو وہ اسے بار سمجھ کر برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی نفع کا سودا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا حریص ہو جاتا ہے۔

[۱۸] نشانیوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو آخرت کے امکان اور اس کے وجوب و لزوم کی شہادت دے رہی ہیں۔ زمین کا اپنا وجود اور اس کی ساخت، اس کا سورج سے ایک خاص فاصلے پر اور ایک خاص زاویے پر رکھا جانا، اُس پر حرارت اور روشنی کا انتظام، اُس پر مختلف موسموں کی آمد و رفت، اس کے اُوپر ہوا اور پانی کی فراہمی، اس کے پیٹ میں طرح طرح کے بے شمار خزانوں کا مہیا کیا جانا، اس کی سطح پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ہیں[۱۹] کیا تم کو سوجھتا نہیں ؟ آسمان ہی میں ہے تمہارا رزق بھی اور وہ چیز بھی جس کا تم سے

ایک زرخیز چھلکا چڑھایا جانا، اس میں قسم قسم کی بے حد و حساب نباتات کا اُگایا جانا، اُس کے اندر خشکی اور تری اور ہوا کے جانوروں کی بے شمار نسلیں جاری کرنا، اس میں ہر نوع کی زندگی کے لیے مناسب حالات اور موزوں خوراک کا انتظام کرنا، اُس پر انسان کو وجود میں لانے سے پہلے وہ تمام ذرائع و وسائل فراہم کر دینا جو تاریخ کے ہر مرحلے میں اس کی روز افزوں ضروریات ہی کا نہیں بلکہ اس کی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا ساتھ بھی دیتے چلے جائیں، یہ اور دوسری اَن گنت نشانیاں ایسی ہیں کہ دیدۂ بینا رکھنے والا جس طرف بھی زمین اور اس کے ماحول میں نگاہ ڈالے وہ اس کا دامنِ دل کھینچ لیتی ہیں۔ جو شخص یقین کے لیے اپنے دل کے دروازے بند کر چکا ہو اس کی بات تو دوسری ہے۔ وہ ان میں اور سب کچھ دیکھ لے گا، بس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے والی کوئی نشانی ہی نہ دیکھے گا۔ مگر جس کا دل تعصب سے پاک اور سچائی کے لیے کھلا ہوا ہے وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ہرگز یہ تصور قائم نہ کرے گا کہ یہ سب کچھ کسی اتفاقی دھماکے کا نتیجہ ہے جو کئی ارب سال پہلے کائنات میں اچانک برپا ہوا تھا، بلکہ اسے یقین آجائے گا کہ یہ کمال درجے کی حکیمانہ صنعت ضرور ایک قادرِ مطلق اور دانا و بینا خدا کی تخلیق ہے، اور وہ خدا جس نے یہ زمین بنائی ہے نہ اس بات سے عاجز ہو سکتا ہے کہ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کر دے، اور نہ ایسا نادان ہو سکتا ہے کہ اپنی زمین میں عقل و شعور رکھنے والی ایک مخلوق کو اختیارات دے کر بے نتھے بیل کی طرح چھوڑ دے۔ اختیارات کا دیا جانا آپ سے آپ محاسبے کا تقاضا کرتا ہے جو اگر نہ ہو تو حکمت اور انصاف کے خلاف ہو گا۔ اور قدرتِ مطلقہ کا پایا جانا خود بخود اس بات کا ثبوت ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کا کام ختم ہونے کے بعد اس کا خالق جب چاہے محاسبے کے لیے اس کے تمام افراد کو زمین کے ہر گوشے سے، جہاں بھی وہ مرے پڑے ہوں، اٹھا کر لا سکتا ہے۔

[۱۹] یعنی باہر دیکھنے کی بھی حاجت نہیں، خود اپنے اندر دیکھو تو تمہیں اسی حقیقت پر گواہی دینے والی بے شمار نشانیاں مل جائیں گی۔ کس طرح ایک خوردبینی کیڑے اور ایسے ہی ایک خوردبینی انڈے کو ملا کر ماں کے ایک گوشۂ جسم میں تمہاری تخلیق کی بنا ڈالی گئی۔ کس طرح تمہیں اُس تاریک گوشے میں پرورش کر کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وعدہ کیا جا رہا ہے۔ پس قسم ہے آسمان اور زمین کے مالک کی، یہ بات حق ہے، ایسی ہی یقینی

تدریج بڑھایا گیا۔ کس طرح تمہیں ایک بے نظیر ساخت کا جسم اور حیرت انگیز قوتوں سے مالا مال نفس عطا کیا گیا۔ کس طرح تمہاری بناوٹ کی تکمیل ہوتے ہی شکمِ مادر کی تنگ و تاریک دنیا سے نکال کر تمہیں اس وسیع و عریض دنیا میں اس شان کے ساتھ لایا گیا کہ ایک زبردست خود کار مشین تمہارے اندر نصب ہے جو روزِ پیدائش سے جوانی اور بڑھاپے تک سانس لینے، غذا ہضم کرنے، خون بنانے اور رگ رگ میں اس کو دوڑانے، فضلات خارج کرنے، تحلیل شدہ اجزائے جسم کی جگہ دوسرے اجزاء تیار کرنے، اور اندر سے پیدا ہونے والی یا باہر سے آنے والی آفات کا مقابلہ کرنے اور نقصانات کی تلافی کرنے، حتیٰ کہ تھکاوٹ کے بعد تمہیں آرام کے لیے سُلا دینے تک کا کام خود بخود کیے جاتی ہے بغیر اس کے کہ تمہاری توجہات اور کوششوں کا کوئی حصہ زندگی کی اِن بنیادی ضروریات پر صرف ہو۔ ایک عجیب دماغ تمہارے کاسۂ سر میں رکھ دیا گیا ہے جس کی پیچیدہ تہوں میں عقل، فکر، تخیّل، شعور، تمیز، ارادہ، حافظہ، خواہش، احساسات و جذبات، میلانات و رجحانات، اور دوسری ذہنی قوتوں کی ایک انمول دولت بھری پڑی ہے۔ بہت سے ذرائع علم تم کو دیے گئے ہیں جو آنکھ، ناک، کان اور پورے جسم کی کھال سے تم کو ہر نوعیت کی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ زبان اور گویائی کی طاقت تم کو دے دی گئی ہے جس کے ذریعہ سے تم اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتے ہو۔ اور پھر تمہارے وجود کی اس پوری سلطنت پر تمہاری اَنا کو ایک رئیس بنا کر بٹھا دیا گیا ہے کہ اِن تمام قوتوں سے کام لے کر رائیں قائم کرو اور یہ فیصلہ کرو کہ تمہیں کن راہوں میں اپنے اوقات، محنتوں اور کوششوں کو صرف کرنا ہے، کیا چیز رد کرنی ہے اور کیا قبول کرنی ہے، کس چیز کو اپنا مقصود بنانا ہے اور کس کو نہیں بنانا۔

یہ ہستی بنا کر جب تمہیں دنیا میں لایا گیا تو ذرا دیکھو کہ یہاں آتے ہی کتنا سروسامان تمہاری پرورش، نشوونما، اور ترقی و تکمیلِ ذات کے لیے تیار تھا جس کی بدولت تم زندگی کے ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اپنے اِن اختیارات کو استعمال کرنے کے قابل ہو گئے۔

ان اختیارات کو استعمال کرنے کے لیے زمین میں تم کو ذرائع دیے گئے۔ مواقع فراہم کیے گئے۔ بہت سی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چیزوں پر تم کو تصرّف کی طاقت دی گئی۔ بہت سے انسانوں کے ساتھ تم نے طرح طرح کے معاملات کیے۔ تمہارے سامنے کفر و ایمان، فسق و طاعت، ظلم و انصاف، نیکی و بدی، حق و باطل کی تمام راہیں کھلی ہوئی تھیں اور ان راہوں میں سے ہر ایک کی طرف بلانے والے اور ہر ایک کی طرف لے جانے والے اسباب موجود تھے۔ تم میں سے جس نے جس راہ کو بھی انتخاب کیا اپنی ذمہ داری پر کیا، کیونکہ فیصلہ و انتخاب کی طاقت اُس کے اندر ودیعت تھی۔ ہر ایک کے اپنے ہی انتخاب کے مطابق اس کی نیتوں اور ارادوں کو عمل میں لانے کے جو مواقع اس کو حاصل ہوئے ان سے فائدہ اٹھا کر کوئی نیک بنا اور کوئی بد، کسی نے ایمان کی راہ اختیار کی اور کسی نے کفر و شرک یا دہریت کی راہ لی، کسی نے اپنے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکا اور کوئی بندگیٔ نفس میں سب کچھ کر گزرا، کسی نے ظلم کیا اور کسی نے ظلم سہا، کسی نے حقوق ادا کیے اور کسی نے حقوق مارے، کسی نے مرتے دم تک دنیا میں بھلائی کی اور کوئی زندگی کی آخری ساعت تک بُرائیاں کرتا رہا، کسی نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے جان لڑائی، اور کوئی باطل کو سربلند کرنے کے لیے اہلِ حق پر دست درازیاں کرتا رہا۔

اب کیا کوئی شخص جس کی بھیجے کی آنکھیں بالکل ہی پھوٹ نہ گئی ہوں، یہ کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کی ایک ہستی زمین پر اتفاقاً وجود میں آگئی ہے؟ کوئی حکمت اور کوئی منصوبہ اس کے پیچھے کارفرما نہیں ہے؟ زمین پر اس کے ہاتھوں یہ سارے ہنگامے جو برپا ہو رہے ہیں سب بے مقصد ہیں اور بے نتیجہ ہی ختم ہو جانے والے ہیں؟ کسی بھلائی کا کوئی ثمرہ اور کسی بدی کا کوئی پھل نہیں؟ کسی ظلم کی کوئی داد اور کسی ظلم کی کوئی بازپُرس نہیں؟ اس طرح کی باتیں ایک عقل کا اندھا تو کہہ سکتا ہے، یا پھر وہ شخص کہہ سکتا ہے جو پہلے سے قسم کھائے بیٹھا ہے کہ تخلیق انسان کے پیچھے کسی حکیم کی حکمت کو نہیں ماننا ہے۔ مگر ایک غیر متعصب صاحبِ عقل آدمی یہ مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انسان کو جس طرح، جن قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اس دنیا میں پیدا کیا گیا ہے اور جو حیثیت اس کو یہاں دی گئی ہے وہ یقیناً ایک بہت بڑا حکیمانہ منصوبہ ہے، اور جس خدا کا یہ منصوبہ ہے، اُس کی حکمت لازماً یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کی بازپرس ہو، اور اس کی قدرت کے بارے میں یہ گمان کرنا ہرگز درست نہیں ہو سکتا کہ جس انسان کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیسے تم بول رہے ہو۔[۲۱]

اے[۲۲] نبی، ابراہیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمہیں پہنچی ہے؟[۲۳] جب وہ اُس کے

وہ ایک خوردبینی خلیے سے شروع کر کے اس مرتبے تک پہنچا چکا ہے اسے پھر وجود میں نہ لا سکے گا۔

[۲۰] آسمان سے مراد یہاں عالمِ بالا ہے۔ رزق سے مراد وہ سب کچھ ہے جو دنیا میں انسان کو جینے اور کام کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اور مَا تُوْعَدُوْنَ سے مراد قیامت، حشر و نشر، محاسبہ و باز پرس، جزا و سزا، اور جنت و دوزخ ہیں جن کے رونما ہونے کا وعدہ تمام کتبِ آسمانی میں اور اس قرآن میں کیا جاتا رہا ہے۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ بالا ہی سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ تم میں سے کس کو کیا کچھ دنیا میں دیا جائے، اور وہیں سے یہ فیصلہ بھی ہونا ہے کہ تمہیں باز پرس اور جزائے اعمال کے لیے کب بلایا جائے۔

[۲۲] اب یہاں سے رکوعِ دوم کے اختتام تک انبیاء علیہم السلام اور بعض گزشتہ قوموں کے انجام کی طرف پے در پے مختصر اشارات کیے گئے ہیں جن سے دو باتیں ذہن نشین کرانی مقصود ہیں۔ ایک یہ کہ انسانی تاریخ میں خدا کا قانونِ مکافات برابر کام کرتا رہا ہے جس میں نیکوکاروں کے لیے انعام اور ظالموں کے لیے سزا کی مثالیں مسلسل پائی جاتی ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت ہے کہ دنیا کی اس زندگی میں بھی انسان کے ساتھ اس کے خالق کا معاملہ صرف قوانینِ طبیعی (PHYSICAL LAWS) پر مبنی نہیں ہے بلکہ اخلاقی قانون (MORAL LAW) اس کے ساتھ کارفرما ہے۔ اور جب سلطنتِ کائنات کا مزاج یہ ہے کہ جس مخلوق کو جسمِ طبیعی میں رہ کر اخلاقی اعمال کا موقع دیا گیا ہو، اس کے ساتھ حیوانات و نباتات کی طرح محض طبیعی قوانین پر معاملہ نہ کیا جائے، بلکہ اس کے اخلاقی اعمال پر اخلاقی قانون بھی نافذ کیا جائے، تو یہ بات بجائے خود اس حقیقت کی صاف نشاندہی کرتی ہے کہ اس سلطنت میں ایک وقت ایسا ضرور آنا چاہیے جب اس طبیعی دنیا میں انسان کا کام ختم ہو جانے کے بعد خالص اخلاقی قانون کے مطابق اس کے اخلاقی اعمال کے نتائج پوری طرح برآمد ہوں کیونکہ اس طبیعی دنیا میں وہ مکمل طور پر برآمد نہیں ہو سکتے۔ دوسری بات جو ان تاریخی اشارات سے ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ جن قوموں نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہاں آئے تو کہا آپ کو سلام ہے۔ اُس نے کہا "آپ لوگوں کو بھی سلام ہے — کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں[۲۳]" پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا[۲۴] اور ایک موٹا تازہ بچھڑا[۲۵] لا کر مہمانوں

بھی انبیاء علیہم السلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پورا رویّہ توحید، رسالت اور آخرت کے انکار پر قائم کیا وہ آخر کار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں۔ تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانونِ اخلاق جو انبیاء کے ذریعہ سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی باز پُرس جو آخرت میں ہونی ہے، سراسر مبنی بر حقیقت ہے، کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھتے ہوئے دنیا میں اپنا رویّہ متعین کیا ہے وہ آخر کار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔

۲۲ے یہ قصّہ قرآن مجید میں تین مقامات پر پہلے گزر چکا ہے۔ ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۳۵۳ تا ۳۵۵، ۵۰۹ تا ۵۱۱۔ جلد سوم، ص ۶۹۶۔

۲۳ے سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے اس فقرے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود ان مہمانوں سے فرمایا کہ آپ حضرات سے کبھی پہلے شرفِ نیاز حاصل نہیں ہُوا، آپ شاید اس علاقے میں نئے نئے تشریف لائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے سلام کا جواب دے کر حضرت ابراہیم نے اپنے دل میں کہا، یا گھر میں ضیافت کا انتظام کرنے کے لیے جاتے ہوئے اپنے خادموں سے فرمایا کہ یہ کچھ اجنبی سے لوگ ہیں، پہلے کبھی اس علاقے میں اِس شان اور وضع قطع کے لوگ دیکھنے میں نہیں آئے۔

۲۴ے یعنی اپنے مہمانوں سے یہ نہیں کہا کہ مَیں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں بلکہ انہیں بٹھا کر خاموشی سے ضیافت کا انتظام کرنے چلے گئے، تاکہ مہمان تکلفاً یہ نہ کہیں کہ اس تکلیف کی کیا حاجت ہے۔

۲۵ے سورۂ ہود میں عِجلٍ حنیذٍ (بُھنے ہوئے بچھڑے) کے الفاظ ہیں۔ یہاں بتایا گیا کہ آپ نے خوب چھانٹ کر موٹا تازہ بچھڑا بُھنوایا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا آپ حضرات کھاتے نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں اُن سے ڈرا[۲۶]۔ انہوں نے کہا ڈریے نہیں اور اسے ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا[۲۷]۔ یہ سن کر اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی، بوڑھی بانجھ![۲۸] انہوں نے کہا "یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے، وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے[۲۹]۔"

---

[۲۶] یعنی جب ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہ بڑھے تو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ اس خوف کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اجنبی مسافروں کا کسی کے گھر جا کر کھانے سے پرہیز کرنا، قبائلی زندگی میں اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ وہ کسی بُرے ارادے سے آئے ہیں۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ اُن کے اس اجتناب ہی سے حضرت ابراہیم سمجھ گئے کہ یہ فرشتے ہیں جو انسانی صورت میں آئے ہیں، اور چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا بڑے غیر معمولی حالات میں ہوتا ہے اس لیے آپ کو خوف لاحق ہوا کہ کوئی خوفناک معاملہ درپیش ہے جس کے لیے یہ حضرات اس شان سے تشریف لائے ہیں۔

[۲۷] سورۂ ہود میں تصریح ہے کہ یہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کا مژدہ تھا، اور اس میں یہ بشارت بھی دی گئی تھی کہ حضرت اسحاق سے اُن کو حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا پوتا نصیب ہوگا۔

[۲۸] یعنی ایک تو میں بوڑھی، اوپر سے بانجھ۔ اب میرے ہاں بچہ ہوگا؟ بائیبل کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر سو سال، اور حضرت سارہ کی عمر ۹۰ سال تھی (پیدائش، ۱۷ : ۱۸)

[۲۹] اس قصے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جس بندے نے اپنے رب کی بندگی کا حق دنیا میں ٹھیک ادا کیا تھا، اس کے ساتھ عقبیٰ میں تو جو معاملہ ہوگا سو ہوگا، اسی دنیا میں اُس کو یہ انعام دیا گیا کہ عام قوانینِ طبیعت کی رُو سے جس عمر میں اس کے ہاں اولاد پیدا نہ ہو سکتی تھی، اور اس کی سن رسیدہ بیوی تمام عمر بے اولاد رہ کر اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی، اُس وقت اللہ نے اسے نہ صرف اولاد دی بلکہ ایسی بے نظیر اولاد دی جو آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی دوسرا انسان ایسا نہیں ہے جس کی نسل میں مسلسل چار انبیاء پیدا ہوتے ہوں۔ وہ صرف حضرت ابراہیم ہی تھے جن کے ہاں تین پشت تک نبوت چلتی رہی اور حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام جیسے جلیل القدر نبی اُن کے گھرانے سے اُٹھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجدید مذہب کے مقاصد اور اُسکی ذمہ داریاں

عبد الحمید صدیقی

"پل صراط" جس سے گزر کر انسان آخرت میں فائز المرام ہوتا ہے اس کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اُخروی زندگی کی سرحد شروع ہونے سے پہلے اگر کوئی کام "پل صراط" عبور کرنے کی طرح اہم نازک اور صبر آزما ہے تو وہ تجدید دین کا کام ہے۔

ان دونوں میدانوں میں انسانوں کو غیر معمولی حزم و احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے پڑتے ہیں اور ذرا سی بھی بے احتیاطی اُسے ناکام و نامراد بنا دیتی ہے۔ اگر آپ ان دونوں مراحل کی نوعیت پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان میں ایک طرف تو کسی شخص کو صبر و ثبات کے ساتھ قدم آگے بڑھانے پڑتے ہیں اور دوسری طرف اسے توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پہلو میں بھی کوئی لغزش ہو جائے تو بڑے تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

آئیے اب یہ دیکھیں تجدید دین کے سلسلے میں ایک مجدد کو کونسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

(۱) ایک مجدد کے لیے سب سے دشوار مرحلہ وقت کے تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہے۔ زندگی رواں دواں ہے اور ہر روز جو آفتاب دنیا پر طلوع ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کچھ نئے مسائل لاتا ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون ہوتا تو تجدید مذہب کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی لیکن زمانے کے ہر آن بدلتے ہوئے تقاضے مذہب کے علمبرداروں سے ہر لمحہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ نئے اُبھرنے والے مسائل کو مذہب کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ حل کیا جائے۔ تجدید مذہب کا کام اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے نئے مسائل کی اہمیت اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جائے پھر معاشرے پر اُن کے اثرات کا تجزیہ کر کے اُن کے چیلنج کو جرأت، حوصلہ مندی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تدبُّر کے ساتھ قبول کیا جائے۔

وقت کے ان نئے تقاضوں کے مقابلے میں اہلِ مذہب نے عام طور پر جو مختلف طرزِ عمل اختیار کیے ہیں انہیں تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک طبقے نے تو سرے سے نئے اُبھرنے والے مسائل کی اہمیت اور اُن کے وزن کو یکسر نظرانداز کیا۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے حضرات نے ہر نئی چیز کو بدعت اور ہر نئی بات کو کفر کہکر اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔ اور جہاں جہاں لوگوں کو مذہب سے انحراف کرتے ہوئے دیکھا انہیں "دردناک عذاب" کی وعید سنائی اور جہاں اُن کا بس چلا وہاں جبر کے ساتھ انہیں نئی روش کو اختیار کرنے سے منع کیا۔ یہ مذہبی طبقہ جسے اسلاف کی مقدس روایات کا امین ہونے کا دعویٰ ہے، اپنی نیکی، پاکبازی، دین کے ساتھ گہری محبت اور اپنی مذہبیت کے باوجود جاہلیت کے سیلاب کو روکنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ دنیا میں جب نئے مسائل کا طوفان امنڈتا ہے تو اُسے محض الفاظ کی یورش سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ان مسائل کا تجزیہ کرکے لوگوں کو بتایا جائے کہ ان میں حق و صداقت کا کتنا حصہ ہے اور باطل کی کس قدر آمیزش ہے۔ جب تک آنے والے مسائل کو اچھی طرح سمجھ کر اُن کے حل کی صحیح راہ معلوم نہ کی جائے محض کفر و الحاد کے فتوے لگانے سے تو کام نہیں بن سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہر عہد کے سارے تقاضے ہی اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان سے صرفِ نظر نہ کیا جا سکے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مسائل بڑے سنگین ہوتے ہیں اور اُن سے اغماض برتنا بڑی کوتاہ اندیشی ہوتی ہے۔ اگر شترمرغ طوفان کے آثار دیکھ کر ریت میں منہ چھپا لے یا کبوتر بلّی کی حریص نگاہوں پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی آنکھیں بند کرلے تو اس سے نہ تو طوفان کا خطرہ ٹل سکتا ہے نہ بلّی اس کی اس بے بسی کو دیکھ کر اس پر جھپٹنے سے باز رہ سکتی ہے۔ یہی حال جاہلیت کے طوفانوں یا کفر و الحاد کی یورشوں کا ہے۔ یہ طوفان اور یہ حملے صرف خیالات و تصورات کی دنیا ہی میں ہلچل پیدا نہیں کرتے بلکہ مذہبی تہذیب کی جڑیں ہلانے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے ان کے معاملے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں محض کفر سازی یا فتوے بازی یا غم وغصے کا اظہار نہیں کرسکتے۔ اس حقیقت کا آپ ماضی سے نہیں بلکہ حال کے واقعات سے اندازہ لگائیں۔

دورِ حاضر کی مادی تہذیب ایک خاص نصب العین اور ایک مخصوص نظریۂ حیات لیکر اٹھی ہے اور اس نے پوری دنیا کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب مذہب کے غلط تصور کے نتیجے میں ابھری ہے اس لیے اس کا آغاز ہی باری تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کی نفی اور مادہ کی خدائی کے اعتراف و اقرار سے ہوا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر انسان کے اندر اس باطل خیال کو راسخ کیا جاتا ہے کہ مادہ کی یہ محدود دنیا ہی سبھی کچھ ہے۔ حرکت، نمو، خمیر، سب مادہ کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ جس طرح کائنات کے مختلف شعبے قوانینِ طبیعی کے پابند ہیں اور وہ اضطراری طور پر ایک خاص روش پر چل رہے ہیں بالکل اسی طرح انسان سے بھی خود بخود ایک خاص نوعیت کے افعال سرزد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس بنا پر کوئی اخلاقی قدر بھی کسی مستقل حیثیت کی حامل نہیں۔ اخلاقی اقدار حالات و واقعات کے تحت بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا خیر و شر کے تصورات، حلال و حرام کی تمیز، خوب و ناخوب کے معیار، ثواب و گناہ کے نظریات سب اضافی چیزیں ہیں جو زمان و مکان کے تابع ہیں۔ وقت اور حالات بدلنے کی وجہ سے ان میں خود بخود تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے۔ خیر و شر کا یہ اضافی تصور مذہب کی عین ضد ہے۔ مذہب کی پوری عمارت ہی اس بنیاد پر قائم ہے کہ باری تعالیٰ کی تعلیمات زمان و مکان کی پابند نہیں وہ مستقل اور پائیدار ہیں اور انسان اپنے آپ کو، اپنے حالات کو اور اپنے گرد و پیش کو اُن کا پابند بنانے کا مکلف ہے۔

یہ تصور مذہب کے لیے ایک شدید چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب یہ باطل نظریہ جس کی تائید کے لیے ایک غلط فلسفہ گھڑا گیا ہے، اور غلط تاریخی شواہد مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہر سوچنے سمجھنے والے دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے اس دور میں نئے انداز پر جتنی تاریخی کتب لکھی گئی ہیں وہ سب اسی غلط نظریہ کی شارح و ترجمان ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں بالکل غیر محسوس طور پر یہ خیال راسخ کیا جارہا ہے کہ عہدِ رعائی (PASTORAL STAGE) میں خدا کا تصور اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اخلاق کے تصورات اُس مخصوص دَور کی پیداوار تھے۔ پھر جب انسانیت عہدِ زراعت (AGRICULTURAL STAGE) میں داخل ہوئی تو یہ تصورات اُس دَور کے بدلے ہوئے تقاضوں کے ساتھ خودبخود بدل گئے۔ اس کے بعد دستکاری کے دَور میں ان میں پھر تبدیلی ہوئی اور سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے بطن سے خدا کے نئے تصور اور حق و باطل کے نئے نظریہ کو جنم دیا۔

اسی طرح معاشرتی مسائل کو دیکھیے۔ ان کے بارے میں بھی اس تہذیب نے لوگوں کے اندر یہ عام احساس پیدا کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مستقل اخلاقی قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ وقت اور حالات کے ساتھ اُن کی افادیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً عہدِ رعائی میں گلہ بانی کے لیے زیادہ سے زیادہ افراد درکار ہوتے تھے۔ اس لیے کثرتِ اولاد ایک رحمت تھی۔ یہی حال عہدِ زراعت اور عہدِ دستکاری میں رہا۔ لیکن دورِ جدید میں جبکہ مشینوں کی فراوانی نے انسانی محنت کی افادیت غیر معمولی حد تک کم کر دی ہے، اولاد کی کثرت رحمت کی بجائے زحمت ہے۔

یہی حال سُود کا ہے۔ پہلے ادوار میں تجارت کا یہ انداز نہ تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ ہر شخص اپنی محنت اور سرمایے سے کام کرتا تھا اور اگر وہ کبھی کوئی چیز دوسرے سے مستعار لیتا تھا تو وہ یہ کام شدید مجبوری کے عالم میں کرتا تھا اس لیے حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سُود کی حوصلہ شکنی کی جاتی۔ چنانچہ اہلِ مذہب نے اسے حرام قرار دیا۔ لیکن آج روپیہ نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے دوسرے سے مستعار لیا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو وسیع پیمانے پر اشیاء کی پیدائش کا انتظام ممکن نہیں کثیر پیداآوری اور زود پیداداری کے لیے سرمایے کی زیادہ سے زیادہ تعداد بنیادی ضرورت ہے۔

سرمایے کی اس غیر معمولی اہمیت نے دولت کے سارے تصورات کو بدل دیا ہے۔ فقر و استغناء، مال و متاع کو آزمائش سمجھ کر اس کے بارے میں حزم و احتیاط، جو مذہبی زندگی کے بنیادی لوازم ہیں اُن کے بارے میں لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویے یکسر بدل گئے اور دَورِ جدید میں انسان نے دولت کو قاضی الحاجات سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی ہے۔

ان حالات میں کون سا ایسا شخص ہے جو ان حقائق کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ جن بے جان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سِکوں کی محبت نے لوگوں کو خدا کی محبت سے غافل کر دیا ہے اور عزو شرف کی ساری قدروں کو بدل کر رکھ دیا ہے ان کے بارے میں کبھی اغماض نہیں برتا جا سکتا۔ اس مسئلہ کو جب تک صحیح طور پر حل نہ کیا جائے اس وقت تک مذہب کی دعوت لوگوں کے لیے اپنے اندر کوئی کشش نہ رکھے گی۔

محض یہ بات کہہ دینے سے کہ سُود حرام ہے یہ پیچیدہ مسائل حل نہیں ہونگے۔ انسان کو جب تک ان کا کوئی خاطر خواہ اور معقول حل نظر نہ آئے اس وقت کوئی دعوت بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ سُود واقعی حرام ہے، یہ ایک سنگین معاشرتی اور معاشی برائی ہے، اس نے مزدوروں کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا ہے۔ اس نے کساد بازاری، بے روزگاری، طبقاتی منافرت کو جنم دیا ہے لیکن عوام کو یہ حقائق باور کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے مغرب کے مختلف معاشی نظاموں کو سمجھیں۔ ان کے اندر جو خامیاں ہیں انہیں طشت از بام کریں اور عملی واقعات سے اُن کی مضرتیں ثابت کریں۔ پھر ان نظاموں کے مقابلے میں اُس نظام کا نقشہ پیش کریں جو ہمیں مذہب نے دیا ہے اور دلائل سے واضح کریں کہ اگر اس نقشے کے مطابق معاشی نظام کی تشکیل کی جائے تو وہ انسانیت کے اخلاقی، روحانی اور مادی تقاضوں کو بطریق احسن پُورا کر سکے گا۔

اس ضمن میں یُوں تو بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتماعی اور معاشی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک آزاد ہو۔ مذہب چونکہ بنیادی طور پر ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے اس میں خارجی محرکات سے کہیں زیادہ داخلی محرکات انسان کو سرگرمِ عمل کرتے ہیں۔ اس بنا پر مذہب سب سے پہلے "اندر کے انسان" کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن اس وقت مغرب نے ہم پر جو معاشی اور معاشرتی نظام مسلط کیا ہے اس میں انسان اجتماعی جکڑ بندیوں کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہے اور حیاتِ اجتماعی کا تندو تیز دھارا اُسے غیر ارادی طور پر جس طرح چاہتا ہے بہا کرلے جاتا ہے۔ وہ بیچارا اپنے لیے اپنی پسند کے مطابق رزق تلاش نہیں کر سکتا۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہ حضرات جو رزقِ حلال کے حصُول کے انتہائی آرزو مند ہیں وہ بھی اس مقدس آرزو کو صرف سینوں میں پالنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر اکتفا کرتے ہیں اور عملی زندگی میں اسی حرام سے پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو خدا کے باغی ناجائز طریقیوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اب اگر تجدید و احیائے دین کا کوئی علمبردار اجتماعی زندگی کی ان جکڑ بندیوں اور ان کے اخلاقی مفاسد کو نظر انداز کر کے عوام کو مذہبی طرز زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنی اس مقدس دعوت کے ساتھ ساتھ ان مفاسد پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ وہ ان جکڑ بندیوں کو کس طرح ڈھیلا کر سکتا ہے تاکہ لوگوں کے ضمیر اور ان کی روح آزاد ہو اور وہ خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے رزقِ حلال کی تلاش کریں اور حرام خوری سے دستکش ہوں۔

دوسری مثال پردہ کی ہے آج مسلمانوں میں بے پردگی کا جو خطرناک رجحان بڑھ رہا ہے اُسے اس ملت کے سارے دردمند افراد بڑی تشویشناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مغربیت کے اس سیلاب نے ایک مرتبہ اُن کی عائلی زندگی کو برباد کر دیا تو پھر اس ملت کو سنبھلنے میں صدیاں لگیں گی۔ عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور وہ اگر ایک دفعہ گھر سے نکل آئی تو پھر اُسے گھریلو ذمہ داریاں قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ نہ کیا جا سکے گا اور یہاں بھی اخلاقی بے راہ روی کا وہی طوفان امڈ آئے گا جس نے آج مغربی زندگی کو دردناک عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ احساس اپنی جگہ صحیح اور درست ہے اور جن خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ بھی بے پردگی کے ناگزیر نتائج ہیں۔ لیکن یہ سوچیے کہ کیا ہم اپنے معاشی، سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھ کر محض وعظ و تلقین سے اس طوفان کو روک سکتے ہیں۔ ہم پر آہستہ آہستہ جو معاشی نظام اپنا تسلط قائم کر رہا ہے بے پردگی، آوارگی اس کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام میں ایک مختصر سا طبقہ تو دن بدن امیر ہوتا چلا جا رہا ہے مگر دوسری طرف انسانوں کی عظیم اکثریت اتنی مفلوک الحال ہو گئی ہے کہ اس کے لیے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں نہ صرف مرد بلکہ عورت بھی اس بات پر مجبور ہے کہ وہ کمائے اور کسی دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر بار نہ بنے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر عزت و آبرو کے ساتھ کمانے کی کوئی معمولی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔ اُسے رزق کی تلاش میں بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی مراکز کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور وہاں بے بس غلام بن کر چند سکوں کے حصول کے لیے محنت و مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ ان حالات میں اگر ایک عورت باپردہ رہنا بھی چاہے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عزمِ صمیم بھی کرے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ چند باہمت خواتین اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ طبقۂ نسواں کی عظیم اکثریت اجتماعی دباؤ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوگی اور وہ دین کی ان ساری قدروں کو اسی طرح پامال کریگی جس طرح کہ انہیں مغرب میں پامال کیا گیا ہے اور اس معاملے میں کوئی بڑی سے بڑی دردمندانہ نصیحت بھی کارگر ثابت نہ ہوگی۔

یہ چند مثالیں جو اوپر پیش کی گئی ہیں کوئی ایسی ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کی نوعیتوں اور ان کے وسیع اثرات کو سمجھنے کے لیے کوئی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت درکار ہو۔ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن سے ہر فرد پوری طرح واقف ہے اور جن کی تلخیوں کو ہر شخص اپنی زندگی میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے مگر بے بس ہونے کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

ہم نے ماضی میں سے چند مثالیں دینے کی بجائے زمانہ حال کے کچھ واقعات صرف اس لیے درج کیے ہیں کہ تجدید و احیائے دین کے کام کی نوعیت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کی نزاکت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ جب جاہلیت کسی قوم پر یلغار کر کے اُس کے پورے نظامِ زندگی میں سرایت کر جائے تو اس وقت سب سے پہلے جاہلیت کے زور کو توڑنے کے لیے اُس کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا پڑتی ہے اور یہ کام اُسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہمیں اس کی قوت کا پوری طرح اندازہ ہو، اس کے کمزور محاذوں کا اچھی طرح علم ہو، اس کے حملوں کی تکنیک اور اس کی سازشوں کے انداز سے پوری پوری واقفیت ہو اور پھر اس قوت کا مقابلہ کرنے کا عزم، اُس سے نبرد آزما ہونے کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوصلہ اور تدبّر ہو۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک مجدّد کو اُس دین اور مذہب کے اندر بھی گہری بصیرت حاصل ہونی چاہیے جس کی تجدید کا عزم لیکر وہ اٹھتا ہے کیونکہ اگر وہ اس دین اور مذہب کے مقصد و منہاج، اُس کے مزاج، اس کے تاریخی ارتقاء کو کما حقہٗ نہیں سمجھتا تو وہ تجدید کے نازک فرض کو حُسنِ نیت اور اخلاص کے باوجود بخوبی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس ضمن میں اُس کے لیے ان چند امور کا اچھی طرح جاننا انتہائی ضروری ہے۔

(۱) تعلیماتِ الٰہی کے ماخذ پر ایک مجدّد کی نہایت گہری نظر ہونی چاہیے۔ مذہب خواہ کوئی ہو اُس کے ماخذ بالعموم دو ہی ہوتے ہیں۔ ایک الہامی کتاب اور دوسرے جس مقدس ہستی پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کا اپنا عمل، کیونکہ اس کا یہ عمل ہی کتاب الٰہی کی صحیح تفسیر و تعبیر ہوتی ہے اور یہ بھی دین میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ خود کتاب اللہ۔ اس تعبیر سے ایک طرف اللہ کے دین کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے ہدایت اور رہنمائی ملتی ہے اور دوسری طرف فکر و نگاہ کے وہ زاویے اور احساسات و جذبات کے وہ پیکر بنتے ہیں جو دین ترتیب و تشکیل دینا چاہتا ہے۔ ایمان، خالق و مالک، کائنات اور ابنائے نوع کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک مخصوص قلبی کیفیت کا نام ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک ایک انسان فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی یہ حالت پیدا نہیں کر لیتا اس وقت تک وہ دین اور اس کے مطالبات اور اُس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ اور یہ چیز دین کے سرسری سے مطالعہ سے تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ انسان عقلِ سلیم اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کرے کہ نہ صرف اُس کے قلب و نگاہ دین کے نور سے منور ہو جائیں بلکہ یہ نور اس کے ضمیر، اس کے وجدان اور اس کے احساس میں پوری طرح سرایت کر جائے اور جہاں کہیں اُسے باطل کی کوئی تاریکی نظر آئے تو اس کی روشن ضمیری فوراً اس کا ادراک کرے۔

یہ مقام صرف مذہب کے ماخذ کی زبان جاننے اور اس کے سطحی مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے حصول کے لیے دین کی سچی محبت، اُسے اپنانے اور دنیا میں سربلند کرنے کا جذبۂ صادق اور اسی وجہ سے اسے سمجھنے کی گہری آرزو نہایت ضروری ہے۔

امام شافعیؒ نے جو بات مفتی کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے وہی بات مجدد کے لیے بھی ضروری ہے:

"خدا کے دین میں فتویٰ دینا صرف اُسی شخص کے لیے جائز ہے جو کتاب اللہ میں گہری بصیرت رکھتا ہو، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، تاویل و تنزیل، مکی و مدنی سورتوں کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ رسول کے بارے میں گہرا علم رکھتا ہو۔ لغت، شعر اور ہر وہ چیز جو قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کام آتی ہو اُن کا عالم ہو۔ اس کے علاوہ منصف مزاج اور متوازن ذہن کا ہو تاکہ حق و انصاف کے ساتھ کوئی رائے دے سکے۔ مختلف ممالک اور علاقوں کے باشندوں کے مزاج، عادات و اطوار کو بھی سمجھنے والا ہو (کیونکہ ان کے اندر جو فطری اختلاف پایا جاتا ہے اسے عملی زندگی میں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا) اور سب سے بڑھ کر استنباط و اجتہاد کا ملکہ رکھتا ہو۔"[1]

(۲) اسی ضمن میں ابن مبارک سے ایک ایسا قول منقول ہے جو فہمِ دین کے صحیح معیار کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے یحییٰ بن اکثم سے دریافت کیا کہ مفتی میں دین کے معاملے میں کونسی خصوصیات ہونی چاہییں تو انہوں نے کہا: "حدیث کا حافظ اور رائے میں بصیرت رکھنے والا۔"

پھر انہوں نے رائے کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد مصالح اور اُن علتوں کی پوری واقفیت ہے جن پر اللہ کی شریعت قائم ہے۔[2]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باقاعدہ ایک

---

[1] منقول از اعلام الموقعین تالیف حافظ ابن قیم - جلد اوّل صفحہ ۴۶

[2] ایضاً صفحہ ۴۲ جلد اوّل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جامع باب تحریر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان علتوں کو سمجھے بغیر احکامِ الٰہی سمجھے نہیں جا سکتے۔ ان کی تصریحات قابلِ غور ہیں:

"دینِ الٰہی میں کوئی شے عبث نہیں ہوتی۔ ان افعال کے ساتھ رضاءِ الٰہی یا اس کی ناراضگی کا تعلق ضرور کسی نہ کسی سبب کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ ان افعال کے ساتھ درحقیقت کچھ ایسے امور اور علتیں وابستہ ہوتی ہیں جو باری تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بنتی ہیں۔ ان امور اور علتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

- برّ و اثم۔ نیکی اور گناہ یعنی وہ امور جو افراد اور معاشرے کی بھلائی اور بُرائی کے ذمہ دار ہیں۔

- دوسرے وہ امور جن کا مقصد دین کے اندر تحریف کا سدِباب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین عوام کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ شرعی احکام کے پیچھے جو مصالح اور علتیں موجود ہیں وہ ایسی نوعیت کی ہوں جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آ سکیں۔ مثال کے طور پر شراب نوشی کو اسلام میں جو حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کے مفاسد اور خرابیاں اتنی واضح ہیں کہ انہیں ہر شخص جانتا ہے۔ شراب کا رسیا احسان اور نیکی سے دُور ہو جاتا ہے۔ خالق اور خلق کے حقوق سے غفلت برتتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس سے معاشرتی، تمدنی اور عمرانی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ یہ تمام امور اکثر و بیشتر شراب نوشی کے لوازمات ہیں اور اسی بنا پر شراب کی تمام اقسام سے منع کیا گیا ہے۔"[1]

یوں تو شرعی احکام کی علتوں کا جاننا ہر شخص کے لیے مفید ہے لیکن ایک مجدد کے لیے تو انتہائی ضروری ہے۔ مجدد کا کام مسندِ افتاء پر بیٹھ کر صرف فتوے صادر کرنا نہیں ہوتا بلکہ نظامِ شریعت کو عملاً نافذ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس تگ و دو میں اُس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک طرف لوگوں کے مزاج کو جانے، اُن کے اندر دین سے انحراف اور بغاوت کے جو رجحانات پیدا ہو چکے ہیں

---

[1] جزو اول ص۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھے اور پھر ان سارے حالات کو سامنے رکھ کر وہ طریقہ اختیار کرے جس سے لوگ بغاوت کی راہ ترک کرکے دین کی راہ اختیار کریں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام کو اُس آسانی کے ساتھ تو سرانجام نہیں دیا جا سکتا جس آسانی کے ساتھ کسی خالی جگہ پر خیمے کو گاڑا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی مجدد کو دین و شریعت کے پُورے نظام پر ایک متوازن نگاہ ڈال کر سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ دین کے مختلف احکام کو جاری کرنے کے لیے تقدیم و تاخیر کی کونسی ترتیب قائم کی جائے۔ اس ترتیب میں مصالح اور علّتوں کی گہری واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر کوئی شخص ان سے ناواقف ہے تو وہ اصول و فروع کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا اور اس طرح دین کے عملی نفاذ کے معاملے میں ٹھوکریں کھا سکتا ہے۔

(۳) مجدد کے لیے تیسری بڑی چیز خدا خوفی، نیکی، پرہیزگاری اور ملت کے اہلِ رائے کا اعتماد ہے۔ دین محض علم کا نام نہیں بلکہ اس میں عمل بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ علم۔ اگر ایک شخص اللہ کے دین کی تجدید کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی دعوت کی طرف لوگ اس وقت تک کبھی متوجہ نہ ہونگے جب تک کہ اُس کی زندگی میں وہ دین کی پوری جھلک نہ دیکھ لیں کسی شخص کی محض دینی معلومات کی وسعت لوگوں کو اس کا عقیدتمند نہیں بنا سکتی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے لوگوں کو اس امر کا اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ شخص جو تجدید دین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اُسے واقعی اللہ کے دین سے گہری محبت ہے، اپنے خالق و مالک پر یقین کامل ہے اور نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا سچا جذبہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اس سعی و جہد کا مقصود کچھ ذاتی منافع یا عزت و شہرت کا حصول نہیں بلکہ محض مالک الملک کی رضا جوئی ہے۔ اپنے خالق و مالک کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے اور وہ صرف اس کے اعتماد اور بھروسے پر اِس فرض کو سرانجام دے رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا کام ننھی منی چڑیوں، جانوروں، ہواؤں سے تو لے لیا ہے لیکن کبھی بھی خدا سے غافل لوگوں سے نہیں لیا۔ دین کی سب سے زیادہ خدمت اُنہی لوگوں نے کی ہے جو بڑے متقی، پرہیزگار، قانع، احکامِ الٰہی کے پابند اور مخلص تھے۔ مجرد وسعتِ علمی کو کبھی کوئی مقام حاصل نہیں ہوا۔ ابوالفضل اور فیضی کی وسیع علمی معلومات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اُن کی ذہانت و فطانت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ زبان پر انہیں عبور تھا، منطق اور فلسفہ کے یہ لوگ ماہر تھے۔ بات کرنے کا ڈھنگ انہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود مجددیت کی خلعت سے مجدد الف ثانی نوازے گئے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ مجدد صاحب کے دل میں دین کی سچی تڑپ موجود تھی اور اُن کے مقابلے میں ابوالفضل اور فیضی کے سامنے بادشاہ کی خوشنودی اور اس کے نتیجے میں دنیاوی عزوجاہ اور مادی منافع کا حصول تھا۔ دین کی خدمت کا شرف انہیں خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آیا ہے جنہوں نے دین کو ہی اپنی زندگی کا منتہائے مقصود اور گوہر مراد سمجھا ہے اور اسے کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ رب العزت کی غیرت نے اس دین کو بعض دوسرے مقاصد کے حصول کا کبھی ذریعہ نہیں بننے دیا۔ اگر کچھ لوگوں نے مختصر سے عرصے کے لیے معدودے چند لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کر دیا تو جلد ہی اُن کی فریب کارانہ سرگرمیوں کا پردہ چاک کر دیا گیا۔ امتِ مسلمہ کی پُوری تاریخ پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ یہاں مختلف اوقات میں مختلف من چلوں نے دین کے اندر کس قسم کی رخنہ اندازیاں پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں بعض حضرات اپنی معلومات کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ممیز و ممتاز تھے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک شخص کے اجتہادات بھی عوام میں قبول نہ کیے جاسکے۔ جب ہم ان متجددین کی ناکامیوں کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس بنا پر ناکام رہے کہ عوام کو ان کی خداخوفی، خلوص نیت اور دیانت پر بھروسہ نہ تھا۔

بعض لوگوں نے غلطی سے تجدید کو تجدّد کا ہم معنی سمجھ لیا ہے۔ اُن کے نزدیک تجدید کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ دین کے اندر ایسی نئی نئی باتیں نہ پیدا کی جائیں جن کا نہ تو پہلے کوئی نام و نشان ملتا ہو اور نہ اُس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہوں۔ مجددین کا انداز تجدد پسندوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ مجددین کے اندر کوئی نئی طرح نہیں ڈالتے بلکہ دین کی پُرانی روایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے تحت نئے طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

© rasailojaraid.com